الکھ نگری میں شخصی خاکوں کی جھلکیاں

Highlights of Character sketches in Alakh nagri

نسرین امین پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر
قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی،حیات آباد،پشاور

ABSTRACT:

Character sketching, is a genre of prose about a human being in which character of a person is studied. Personality is a piece of writing or article that gives a strong impression of a person. The tradition of character sketching in Urdu is not very old. Muhammad Hussain Azad's(10Th June1830-22nd January1910) book "Aab-e-Hayat" is considered to be the first book of sketching in Urdu literature, which in turn gave the consciousness of sketches. After Muhammad Hussain Azad in 1927, Mirza Farhatullah Baig (1st September 1883-27th April 1947) wrote " Nazir Ahmad ke kahani". After this a series of continues to increasing day by day. Urdu sketches started and Mumtaz Mufti (11thSeptember1905 till 27thOctober1995) is one of the great names in the history of Urdu literature. His creation began with fiction in 1936, but in addition to that he also made a unique contribution to genres like novels, travelogue, essay, drama and Sketching. In the field of character sketching Mumtaz Mufti published four prominent books, naming; "piaz k chilkay" in 1968, "okhey loag" in1986, "oar okhey loag" in 1990 and "okhey olray" published in 1995. It covers his life from 1957 to 1992. The study -autobiography nagri" is the second part of Mumtaz Mufti's "Alakh of "Alakh nagri" shows different features of his writing style. There are samples of his character sketches, examples of which will be discussed in this article.

Keywords:

Character sketching, The beginning of character sketching, Mumtaz Mufti's character sketching, "Alakh Nagri", Character sketches included in "Alakh Nagri"

خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخص کے حقیقی خدوخال پیش کیے جاتے ہیں۔اس میں ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی دلکش اور دلچسپ پیرائے میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ادبی اصطلاح میں خاکہ وہ تحریر یا مضمون ہے جو کسی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کرے۔ اسے کسی شخص کی قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں یا شخصی مرقع۔خاکہ نویسی کو شخصیت نگاری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ایک اچھے خاکے میں ہم کسی شخص کے بنیادی مزاج،اُس کی افتادِ طبع،اس کے اندازِ فکر و عمل اور اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔خاکہ نگاری شخصیت کی عکاسی کا فن ہے۔جس میں خاکہ نگار کسی شخص سے متعلق اہم پہلوں کو اس مہارت سے پیش کرتا ہے کہ اس شخص کی پوری شخصیت قاری کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

منصف خان سحاب اپنی کتاب "نگارستان" میں بشیر سیفی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خاکہ ایسا فن پارہ ہے جس میں کسی فرد کی سیرت و کردار کے اہم پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ شخصیت چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی نظر آئے نیز اس کے مثبت اور منفی اور جلوت و خلوت دونوں پہلوؤں کی ایسی جھلک دکھائی جائے جو شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہو۔"[1]

فنِ خاکہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت پر قلم اُٹھائے تو اصل حقیقت میں تبدیلی کے بغیر اپنی زبان دانی کے ایسے جوہر دکھائے کہ قاری کے ذہن میں اس کی پوری شخصیت اُبھر کر سامنے آجائے۔اس فن کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس میں بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت پڑتی ہے اور خاکہ نگار اس بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے خارجی حالات و واقعات سے مدد لے کر اپنے داخلی مشاہدات کی مدد سے شخصیت کے نئے اور پوشیدہ نقوش کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔خاکے کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے ہم کسی مخصوص

شخصیت سے ملاقات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے آس پاس کے ماحول سے بھی واقفیت پیدا کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاکہ نگار یا شخصیت نگار انسانی شخصیت کے اندرونی اور بیرونی رازوں کو جاننے کے سفر پر نکلتا ہے اور اس سفر میں اپنی گہری نظر اور مشاہدے کو کام میں لاتے ہوئے اپنے انداز میں ایک شخصیت کو قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اردو کے قدیم تذکروں اور دوسری تحریروں میں خاکہ نگاری کے فن کے ہلکے پھلکے نقوش ملتے ہیں۔ لیکن انہیں خاکہ نگاری کی صف میں نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ وہ تحریریں نیم خاکے کے زمرے میں آتی ہیں۔ اردو خاکہ لکھنے کی شعوری کوشش پہلی مرتبہ محمد حسین آزاد (۱۰جون ۱۸۳۰ء—۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء) نے اپنی کتاب "آب حیات" سے کی ہے۔ یعنی "آب حیات" وہ پہلی کتاب ہے جس نے خاکوں کا شعور دیا۔ محمد حسین آزاد کے بعد ۱۹۲۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ (یکم ستمبر ۱۸۸۳ء– ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء) نے "نذیر احمد کی کہانی" لکھی۔ اس بارے میں محمد حسین جامی اپنی کتاب "اردو خاکہ نگاری" میں لکھتے ہیں:

> "اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مرزا فرحت اللہ بیگ پہلے خاکہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی" ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مکمل خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان سے قبل محمد حسین آزاد کی تصنیف "آب حیات" میں بھی کئی شخصیات کے مختصر خاکے مل جاتے ہیں، لیکن ان کی اہمیت صرف ابتدائی نقوش کی ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی" خاکہ کے فنی اُصول پر کھرا اُترتا ہے۔"[۲]

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> "فرحت اللہ کی خاکہ نگاری میں شخصیت کی ہیئت کذائی، اس کے مکان اور خانگی رہن سہن کے بہت زیادہ تفصیلی تذکرے ہوتے ہیں اور نشست وبرخاست، آدابِ عادات واطوار وغیرہ کے سلسلے میں بھی ان کا زاویہ نظر زیادہ تر خارجی ہوتا ہے۔ مگر بہ حیثیت مجموعی ان کا فن اور خصوصاً ان کی نذیر احمد کی کہانی اردو خاکہ نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہی تو اردو کا پہلا خاکہ تھا سچّا اور صحیح۔"[۳]

۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے آل انڈیا ریڈیو دہلی پر پڑھے گئے گیارہ مختصر خاکوں کا مجموعہ "کیا خوب آدمی تھا" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے پہلے پانچ خاکے ۱۹۲۹ء میں لکھے گئے ہیں جو راشد الخیریؔ، حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، چکبستؔ اور داغؔ سے متعلق ہیں۔ پریم چند، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کے خاکے دس سال بعد یعنی ۱۹۳۹ء کی تحریریں ہیں اور آخری تین یعنی علامہ اقبال، سر راس مسعود اور مولانا محمد علی جوہر کے خاکے ۱۹۴۰ء میں نشر ہوئے۔ گیارہ سال کی تحریروں کے اس چھوٹے مجموعے میں فن کا ارتقاء واضع طور پر نظر آتا ہے۔[۴]

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد لکھنے والوں میں آغا حیدر حسن دہلوی، بابائے اردو مولوی عبد الحق، محمد عبد الرزاق کانپوری، عبد الماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، محمد شفیع دہلوی، جے نندر کمار، بشیر احمد ہاشمی، غلام السیّدین، فکر تونسوی، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتونؔ، مالک رام، ڈاکٹر اعجاز حسین، چراغ حسن حسرتؔ، محمد طفیل، عبد المجید سالک، ضیاء الدین احمد برنی اور شاہد احمد دہلوی قابل ذکر ہیں۔ خاکہ نگاروں کی یہ فہرست اتنی مختصر نہیں بلکہ یہ سلسلہ کافی طویل ہے اور روز بہ روز اس میں بدستور اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا مکمل احاطہ مقالہ نگار کے اس مختصر تعارف میں ممکن نہیں۔ مقالہ نگار نے یہ تمہید ممتاز مفتی کی آپ بیتی کے دوسرے حصّے "الکھ نگری" میں شخصی خاکوں کی جھلکیوں پر بحث کرنے کی غرض سے باندھی ہے۔

ممتاز مفتی اردو ادب کی تاریخ کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ ان کی تخلیقات کا آغاز ۱۹۳۶ء میں افسانہ نگاری سے ہوا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو صنف نثر کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان اصناف میں خاکہ نگاری کی صنف بھی شامل ہے۔ ممتاز مفتی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ہمارے ہاں خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ خاکہ ایک سُپر فیشل لفظ ہے اور اس میں تضحیک کا عنصر موجود ہے۔"[۵]

اور شخصیت نگاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "انسان کی شخصیت ایک گورکھ دھندہ ہے۔ ایک ایسا الجھاؤ جس کا سرا نہیں ملتا۔ میری دانست میں انسانی شخصیت کو پیاز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ فرد کی

حیثیت چھلکے کی ہے۔ چھلکے ہی چھلکے، چھلکے ہی چھلکے۔ ایک دوسرے سے نہیں
ملتا، ایک دوسرے کی شکل قطعی طور پر مختلف---اگرچہ بظاہر وہ سب ایک
سے نظر آتے ہیں۔ بظاہر سپاٹ مگر غور سے دیکھو تو ان میں رنگ کی
دھاریاں ہیں۔ ہلکے مگر واضع خطوط ہیں۔ منفرد بیل بوٹے ہیں۔"[۶]

شخصیت نگاری کی صنف میں ممتاز مفتی کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ "پیاز کے چھلکے "۱۹۶۸ء، دوسرا مجموعہ "اوکھے لوگ "۱۹۸۶ء، تیسرا مجموعہ "اور اوکھے لوگ "۱۹۹۰ء اور چوتھا مجموعہ "اوکھے اولڑے "۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید، ممتاز مفتی پر لکھے گئے اپنے شخصی خاکے "مہااوکھا" میں لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب کہتے ہیں۔ "مجھے شخصیت نگار ہونے کا زغم نہیں ہے"۔ لیکن
وہ شخصیت کے پیاز کو اس فنکاری سے چھیلتے ہیں کہ پیاز ختم ہو جاتا ہے لیکن
شخصیت مفتی صاحب کی مٹھی سے ہر گز نہیں نکلتی وہ اسے چمکاتے چلے
جاتے ہیں۔ چند سال قبل ایک کتاب "اوکھے لوگ" کے عنوان سے لکھی
تھی اب اس کتاب کا ترمیم شدہ ایڈیشن "اور اوکھے لوگ" کے نام سے شائع
کیا ہے۔ پہلی کتاب میں شخصیات کی تعداد صرف بارہ تھی اب یہ تعداد
چوبیس ہو گئی ہے ان خاکوں کو پڑھ کر مفتی صاحب سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے
کہ اگر شخصیت نگار آپ جیسا نہیں ہوتا تو وہ کیسا ہوتا ہے؟"[۷]

الکھ نگری ممتاز مفتی کے ناول "علی پور کا ایلی "کا دوسرا حصّہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ممتاز مفتی کی خود نوشت کا یہ دوسرا حصّہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ جس کے ابتداء ہی میں ممتاز مفتی نے اعتراف کر لیا ہے کہ:

"یہ کتاب میری آپ بیتی "علی پور کا ایلی "کا دوسرا حصّہ ہے۔ علی پور کا ایلی
میں، میں نے یہ بات چھپائی تھی کہ میں ہی ایلی ہوں۔ پھر بھید کھل گیا اور
میں نے تسلیم کر لیا کہ میں ایلی ہوں۔ الکھ نگری میری آپ بیتی کا دوسرا حصّہ
ہے جو ۱۹۴۷ء سے شروع ہو کر آج تک کے عرصے پر مشتمل ہے۔"[۸]

"الکھ نگری" تکنیکی اعتبار سے "علی پور کا ایلی" سے مختلف ہے کیونکہ اس پر ممتاز مفتی نے استعارے کا پردہ نہیں ڈالا اور نہ ہی اسے ناول بنا کر پیش کیا بلکہ جو حالات ان پر بیٹے اور جو تجربات انھوں نے کئے، انہیں براہ راست اپنے قاری تک پہنچایا۔

> "۱۹۶۱ء میں، میں نے "علی پور کا ایلی" لکھی تھی۔ وہ میری خود نوشت کا پہلا حصّہ تھی۔ لیکن میں نے اسے آپ بیتی کی شکل میں نہیں لکھا تھا۔ ان دنوں مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی، حوصلہ نہ تھا کہ ان واقعات کو اپناتا جو علی پور کا ایلی میں درج ہیں۔۹

ممتاز مفتی نے اپنے ان خیالات اور تجربات ومشاہدات کو ۱۹۶۵ء میں "ایلی اور الکھ نگری" کے نام سے لکھنے کا آغاز کیا اور اس کے کچھ حصّے سیارہ ڈائجسٹ میں شائع بھی ہوئے۔ لیکن پھر سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر بدل گئے اور نئے ایڈیٹر ان کی تحریروں کو شائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے لکھنا بند کر دیا۔

> "نئے مدیر میری تحریروں کو شائع کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کے برتاؤ کو دیکھ کر میں نے مزید قسطیں لکھنی بند کر دیں۔"۱۰

"الکھ نگری" ممتاز مفتی کی ۴۵ سالوں کی روداد سناتی ہے کیونکہ "علی پور کا ایلی" ان کے ابتدائی ۴۲ سالوں یعنی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کی زندگی کا اخاطہ کرتی ہے، جبکہ "الکھ نگری" ۱۹۵۷ء سے ۱۹۹۲ء تک کی زندگی پر محیط ہے۔ ممتاز مفتی نے یہ کتاب محترمہ ڈاکٹر عفّت شہاب، محترم خواجہ جان محمّد بٹ اور محترم سید سرفراز شاہ کے نام سے منسوب کی ہے اور ساتھ ہی ان کی کرم نوازیوں کا اعتراف کیا ہے کہ "جن کی کرم نوازیوں نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔"

الکھ نگری کے مطالعے سے جہاں اس میں ممتاز مفتی کے اسلوب کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں ،وہاں اس میں ممتاز مفتی کے شخصی خاکوں کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ پھر یہ تو ایک فطری عمل ہے کہ انسان دنیا میں رہے گا تو اس کا دنیا میں رہنے والوں سے تعلق بھی قائم ہو گا۔ ممتاز مفتی کی زندگی میں بھی لوگوں کا آنا جانا لگا رہا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنی آپ بیتی میں ان شخصیات کا ذکر کیا ہے جو ان کی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑ گئے ہیں۔ ان شخصیات میں اہم اور غیر اہم دونوں طرح کی شخصیات شامل ہیں۔ ان شخصیات کے ذکر میں ممتاز مفتی نے صرف ان کا ذکر یا ان سے متعلق واقعات کا ذکر

ہی نہیں کیا بلکہ ان شخصیات سے اپنے قاری کو متعارف بھی کروایا ہے یعنی ان کی جیتی جاگتی تصویر بھی اپنے قاری کے سامنے پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ الکھ نگری کے پہلے ہی باب "پاکستان" میں ہماری کئی شخصیات سے ملاقات کروائی جاتی ہے۔ جن میں خالہ سرداراں، احمد اں ،بالا، پرمیلا اور فکر تونسوی کے شخصی خاکے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ فکر تونسوی جو ہندوستان کے ایک مایہ ناز شاعر ہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل لاہور میں مقیم تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ممتاز مفتی نے ان کی جان بچا کر انہیں ہندوستان کے لیے رخصت کیا تھا۔ اس واقعہ کے بیان سے قبل ممتاز مفتی نے فکر تونسوی کا شخصی خاکہ بیان کر کے ہمیں ان کی ذات سے روشناس کروایا ہے۔

> "فکر میں عجز ٹوٹ ٹوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گردن اٹھا کر نہیں لٹکا کر چلتا تھا ۔اسے باتیں کرنے کی نہیں بلکہ سننے کی عادت تھی۔ اس نے کسی معاملے میں کبھی اپنی رائے پیش نہ کی تھی گمان ہوتا کہ اس کی اپنی رائے ہے ہی نہیں۔ حالانکہ وہ ایک دانشور تھا درحقیقت وہ دل کی گہرائیوں میں جیتا تھا اور وہ اتنی گہری تھیں کہ کوئی لہر اُبھر کر سطح پر نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ کے سوا کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔"[۱۱]

دوسرا باب "کمپ" کے عنوان سے ہے۔ ممتاز مفتی نے پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ والٹن ریفیوجی کیمپ میں بطور مقرر ملازمت کی تھی۔ اپنی آپ بیتی میں اس ملازمت کے کوائف بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنی شریک حیات اقبال بیگم کے علاوہ کئی دوسری عورتوں کے خاکے پیش کئے ہیں۔ جن میں خانہ بدوش، شعلہ، مینا، نوشابہ، ناجو (چتری) شامل ہیں۔ الکھ نگری کے اس باب میں چتری چھائی ہوئی ہے۔ چتری کو ممتاز مفتی نے اپنی آئیڈیل عورت بتایا ہے اور اس کا خاکہ کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "وہ گاؤں کی ایک مٹیار تھی۔ اس کا قد لمبا تھا، جسم بھرا ہوا تھا، جوانی پھٹی جا رہی تھی، رنگ سانولا تھا، نقش تیکھے تھے، آنکھیں مدھ بھری تھیں اور انداز میں بے نیازی کے انبار لگے ہوئے تھے۔"[۱۲]

> "وہ مٹیار دراصل میری آئیڈیل عورت تھی۔ اونچا لمبا قد، بھرا بھرا جسم، بے نیاز، بے پروا، یہ خصوصیت میرے ذہن کی آئیڈیل عورت کی خصوصیت تھیں۔"[۱۳]

تیسرا باب "ہم دونوں" کے عنوان سے ہے اور اس عنوان کے تحت ممتاز مفتی نے اپنے اور احمد بشیر کے تعلقات کو بیان کیا ہے لیکن اس باب میں مانی (احمد بشیر) چھایا ہوا ہے۔ احمد بشیر کی شخصیت کے بارے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"مانی ان دنوں ایک گرین یوتھ تھا۔ وہ بے حد خوب صورت تھا۔ دلیر اس قدر تھا کہ ڈر یا احتیاط سے سرے سے واقف ہی نہیں تھا۔ ان جھک تھا۔ کسی سے دبتا نہ تھا۔ ذاتی مفاد کا اسے کبھی خیال نہ آیا تھا۔ دنیاداری سے قطعی کورا تھا۔"[۱۴]

چوتھا باب "کرشن نگر" میں ممتاز مفتی کی ملاقات اشفاق احمد اور آزر زوبی سے ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی ،اشفاق احمد کو اپنی پہلی ملاقات میں ایک خوبصورت عورت سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک روز جب میں کیمپ کے ایک کونے میں سوچ میں ڈوبا ٹہل رہا تھا تو ایک چٹی سفید گلابی جھال میں ڈوبی ہوئی، شگفتگی سے بھری ہوئی، قدرتی طور پر بنی سجی کشمیرن میرے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں چمکا کر بولی، آپ ممتاز مفتی ہیں نا۔---میں نے حیرت سے سیندھوری میدے سے بنی ہوئی خاتون کی طرف دیکھا۔---پہلی مرتبہ میں اشفاق احمد سے ملا تو ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے تاگے سے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ اس کی بھرپور جوانی، جھلمل جھلمل کر رہی تھی اور اس پر انبساط کی پھول پتیاں ٹانکی ہوئی تھیں۔"[۱۵]

یہاں سے ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کی دوستی کا آغاز ہوتا ہے جیسے جیسے یہ دوستی پروان چڑھتی ہے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں اس قربت کے رشتے میں ممتاز مفتی نے اشفاق احمد کو مختلف زاویوں سے اپنے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

"پہلے روز جب میں نیم چھتی میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا، چاروں طرف کتابوں کے ریک لگے ہوئے تھے۔ فرش پر یہاں وہاں کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تمام زاویے نیچے کی طرف گرے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی پر سوچوں کی سلوٹیں تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے گرد اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ یا اللہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ وہ اشفاق تو نہ تھا

جس سے میں واقف تھا۔ یہ تو کوئی رابنسن کروزو ہے جو اس نیم چھتی جزیرے
میں رہتا ہے۔"[۱۶]

ایک روز اشفاق احمد ان کی اپنے دوست ذوبی سے ملاقات کرواتے ہیں۔ ذوبی ایک بہت بڑا مصور تھا ۔ذوبی کا خاکہ ممتاز مفتی نے کچھ یوں لکھا ہے:

"ذوبی ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کم گو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی ۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، پیچ کس آنکھیں۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ لیکن خدوخال ایسے تھے کہ ذہن کی چمک منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین مزاج تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، اتنے ڈھیر کہ جمود کا شبہ ہوتا، لیکن جب وہ بات کرتا تو چہرے کے بند دروازے کھل جاتے، بے نیازی کا گرد اُڑ جاتا۔ کچھ ایسا منظر بدلتا جیسے کالی گھٹا بجلی لہراتی، لیکن کڑک پیدا نہیں ہوتی تھی، چونکہ وہ مدہم سروں میں بات کرنے کا عادی تھا۔"[۱۷]

ذوبی کے ذکر میں ممتاز مفتی نے ذوبی کی پوری زندگی قاری کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ اس میں انھوں نے ذوبی کے کاروبار، اوپن ائیر تھیٹر کی مصروفیات، اس سے ملنے آنے والی خواتین، ان کے گھر کا احوال اور ذوبی، عنایت اللہ سے آذر ذوبی کیسے بنا، کی مکمل کہانی بیان کر دی ہے۔

اس باب میں ممتاز مفتی، مانی کی نوکری کے سلسلے میں چراغ حسن حسرت سے ملاقات کرواتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کے ذکر کے ساتھ ممتاز مفتی اپنے قاری کو ان کی شخصیت کا تعارف کروانا نہیں بھولتے۔ لکھتے ہیں:

"مولانا چراغ حسن حسرت عالم آدمی تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ زبان دان تھا۔ تہذیب و تمدن اس کی نس نس میں رچے ہوئے تھے۔ رکھ رکھاؤ کا شیدائی تھا، منہ پھٹ تھا، لیکن بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ وہ انسانیت کا دلدادہ تھا اور پرانے نوابوں کی طرح پی کر چوباروں میں شدھ راگ سننے کا شوقین تھا۔"[۱۸]

ممتاز مفتی کا اپنی ادب بیتی کا بیان بھی اسی باب کا حصّہ ہے اس باب میں انھوں نے اپنے کئی اعترافات کے ساتھ ہمیں چودھری برکت علی سے متعارف کروایا ہے۔ چودھری برکت علی ہی وہ شخصیت ہیں جن کی بدولت ممتاز مفتی صاحبِ کتاب بنے تھے۔

"چودھری برکت علی ایک قابل بزنس مین تھا۔ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ ہر بات کو پلان کرتا تھا۔ انویس منٹ کو بگ بزنس کے حوالے سے دیکھتا تھا ۔ سچی بات یہ ہے کہ چودھری برکت علی شخصیت اور کردار کے لحاظ سے ایک بڑا آدمی تھا۔ حسابی اتنا کہ نالے کے کنارے پر رُک کر سوچ میں پڑ جائے، غنی ایسا کہ سوچے سمجھے بغیر دریا پھلانگ جائے۔ بگڑنے پر آئے تو چھوٹی سی بات پر بگڑ جائے۔ درگزر کرنے پر آئے تو بڑی سے بڑی بات کو نظر انداز کر دے۔ چودھری برکت علی کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی، لیکن اس میں منفی عنصر نہ تھا۔"[۱۹]

اس باب کے چھ حسین لڑکیاں والے حصے میں ممتاز مفتی کے ریسرچ سنٹر میں نوکری کرنے کے زمانے کا احوال بیان ہوا ہے اور اس زمانے میں یوسف ظفر ان کے ہم کار تھے۔ یوسف ظفر کے بارے میں لکھتے ہیں :

"یوسف ظفر جانا پہچانا شاعر تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کا ایک فعال رکن تھا۔---یوسف ظفر کا قد چھوٹا تھا، لیکن چھوٹے قد میں اتنی جان تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ حرکت کا دلدادہ تھا۔ شاعر ہونے کے باوجود گھر بیٹھو نہیں تھا، ایکسٹر وورٹ تھا، بے چین تھا ،جوشیلا تھا، اس کی زندگی پسند ناپسند کے محور پر گھومتی تھی، جو پسند تھا وہ اچھا تھا، جو ناپسند تھا وہ برا تھا۔ یوسف ظفر گھریلو آدمی نہیں تھا۔ گھر کے متعلق اس کا رویہ غیر ذمہ دارانہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو گھر ذہن سے یکسر خارج

ہو جاتا۔---اگرچہ وہ شیخ برادری سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں شیخوں
کے سے اوصاف نہ تھے۔اسے پیسے سے پیار نہ تھا نہ ہی وہ اسے سنبھال کر رکھ
سکتا تھا۔"۲۰

پانچواں باب کا عنوان "راول دیس" ہے۔روال دیس کے باب میں اس وقت کا ذکر ہے جب ممتاز مفتی ریڈیو آزاد کشمیر میں کام کرتے تھے۔اس نوکری سے فارغ ہونے کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعے اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر کی ملازمت مل جاتی ہے۔اس دفتر میں ان کی ملاقات ربیعہ فخری سے ہوتی ہے۔

"ربیعہ فخری گریجویٹ تھی،اہل زبان تھی،سادہ مزاج
تھی،ملنسار تھی۔اس میں کوئی نسائی نخرہ نہ تھا۔کمرے میں داخل ہوتی تو یہ
احساس نہ ہوتا کہ کوئی خاتون آئی ہے۔نہ تو وہ خصوصی میک اپ کرتی تھی
اور نہ اسے بناوٹ سجاوٹ کا شوق تھا۔طبعاًوہ ایک محنتی لڑکی تھی۔ربیعہ کے
جسم کے نچلے حصّے میں ایک عجیب سا خم تھا۔جو چلتے وقت خاصہ نمایاں ہو جاتا
تھا۔ایسے لگتا تھا جیسے کسی ڈبے پر تانگے کا پہیہ گزر گیا ہو اور اس میں ایک
دائمی "چپ" پڑ گیا ہو۔"۲۱

اسی دور میں ممتاز مفتی اور ان کے ساتھیوں نے ایک انجمن بنائی ہوتی ہے جسے "چھڈیار" کا نام دیا جاتا ہے۔اس چوگڑی کے بارے میں بتاتے ہوئے ممتاز مفتی نے اس میں شامل ارکان کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔سب سے پہلے محمد عمر کی بات کرتے ہیں۔

"سب سے پہلے محمد عمر ہے،جس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے اسے متفقہ طور پر
لائف لیڈر منتخب کیا گیا۔پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ سیان پت اور معتبری کے بوجھ
سے ہمیشہ کے لیے ازلی طور پر آزاد ہے۔اس کے اندر کا بچہ ہمہ وقت اس کے
کندھے پر سوار رہتا ہے۔پہاڑوں پر پہنچ کر اس کے اندر کا شرپا بیدار ہو جاتا ہے
۔پھر اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی ہلیری کو کندھوں پر اُٹھا کر چوٹی پر گاڑ سکے،جس
طرح ہمارے تمام شرپے کیا کرتے ہیں۔لیڈر کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ

اسے چودھری کہہ کر بلایا جائے۔ مطالبہ صرف کہہ کر بلانے کا ہے، سمجھنے کا نہیں۔ پکارنے کے بعد چاہے آپ اسے اپنے کام میں لگائے رکھیں وہ سودا لائے گا، آپ کے لیے کھانا پکائے گا، برتن دھوئے گا، چائے پکائے گا اور ضرورت پڑے تو آپ کے پاؤں دبائے گا، لیکن خبردار! اسے مسلسل چودھری جی کہنا ضروری ہو گا، ورنہ نتائج کی ذمے داری خود آپ پر ہو گی۔ اس لحاظ سے لیڈر کی حیثیت خالص مرد جیسی ہے۔"۲۲؎

"دوسرا رکن مسعود قریشی شاعر ہے۔ شاعر کا زاویہ نگاہ سائنسی ہے۔ نثر نگار کی طرح سوچتا ہے۔ غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے، لیکن شعر کہتا ہے۔ اچھے اور پُر معنی شعر۔ شاعر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دفتر کو مندر کا رتبہ دے رکھا ہے۔ شاعر کے اندر کا بچہ طویل دفتری تپسیا کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ اس کی ذمہ داری شاعر پر نہیں، بچے پر ہے۔ وہ اس قدر جاندار تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں مر سکا۔"۲۳؎

"تیسرا رکن حمید اعظمی ہے۔---حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ خاوند کی حیثیت سے چون چرا ہے۔ لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شخصیت ہے۔ مسلسل مفرح مسکراہٹ، خدمت گار، مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھوار اڑتی رہتی ہے۔ مزاح اور حاضر جوابی کی بنا پر اسے اعلیٰ درجے کا مزاح نگار ہونا چاہیے تھا۔---اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے اس کا نام وِٹ رکھ دیا ہے۔"۲۴؎

"چوتھا رکن اشفاق احمد داستان گو ہے۔---داستان گو بڑا گنی آدمی۔ بڑا معروف جانا پہچانا۔ مگر طبیعت کا برا ہمن ہے۔ ذات پات کا بڑا قائل ہے۔ اونچا بیٹھ کر بات کرتا ہے، لیکن بات کا دھنی ہے---باتوں باتوں کا ایسا جال پھیلاتا ہے کہ سننے والوں میں خود اسیر ہونے کی خواہش چٹکیاں لینے لگتی ہے، ذات کا پٹھان ہے، اندر سے خالص اوپر سے "کاٹھا"۔۲۵؎

"پانچواں رکن عماد الدین انجینئر ہے۔---انجینئر تضادات کی کھچڑی ہے۔ایک پلو میں ایمان بندھا ہے، دوسرے میں سائنس۔ایک جیب میں فنون کا شوق، دوسری میں مشینوں کی پرستاری۔اعمال کٹر مسلمان کے، خیالات کٹر مادہ پرست کے، کندھے پر تصوف کا چولا، ماتھے پر حجت کا ٹیکہ۔"۲۶

"چھٹا رکن عکسی مفتی فوک لوریا ہے، جو اعزازی طور پر ڈرائیور کا کام کرتا ہے ۔اسے مناظر سے دلچسپی نہیں، لوگوں سے ہے۔لوگوں سے بھی نہیں، ان کے رہت بہت سے ہے۔وہ ایسا بادام ہے جس میں دو مغز ہیں ایک صوفی فلاسفر ہے۔دوسرا شدھ انگریز۔جب وہ ایوالُوشن (ارتقاء) کی بات چھیڑ دے تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔اور وہ ہمیشہ تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور ایوالُوشن کی بات چھیڑے۔"۲۷

اسی باب میں ممتاز مفتی نے اپنے ایک اور قریبی دوست محمد حسین کا ذکر بھی کیا ہے جن کی فرمائش پر انھوں نے ڈرامہ "نظام سقہ" لکھا تھا۔محمد حسین کی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"محمد حسین بنیادی طور پر گونگا آدمی تھا۔محفل میں بات کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ویسے دیکھنے میں وہ نہایت معقول اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔---محمد حسین میں نہ تفاخر تھا، نہ جوش، نہ جذبہ۔محمد حسین کی آواز بالکل ہی معمولی نوعیت کی تھی اور شاید اسی لیے وہ چھوٹی آواز کے زیر و بم میں غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ ریہرسل میں محمد حسین کا ادا کیا ہوا مکالمہ عام سا مکالمہ سنائی دیتا تھا لیکن جب وہ مائک کے ذریعے لاؤڈ سپیکر سے ادا ہوتا تو میں اسے سن کر حیران ہو جاتا تھا۔"۲۸

اس باب میں ایک عنوان "نیم چھتی میں کالی بلی" ہے اس میں ممتاز مفتی نے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی محبت کی کہانی بیان کی ہے۔ان کی شادی میں بھی ممتاز مفتی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔بانو قدسیہ کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ محترمہ بڑی چترکار تھی۔اوپر سے جدید، اندر سے قدیم، اوپر سے سادمرادی، اندر سے بن ٹھن، اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ، اندر سے جذباتی ہلچل، اوپر ذہن ہی ذہن، نیچے دل ہی دل، وہ محترمہ دروپدی اور گیشیا کا سنگم

تھی۔ وہ محترمہ متاثر ہو کر پیچھے ہٹنے کی عظمت سے واقف تھی۔ وہ محترمہ ان
مشرقی خواتین میں سے تھی جو پیچھے ہٹنے والے مردوں کو پہچانتی ہیں اور خود
پیچھے ہٹ کر انہیں پیچھے ہٹنے کی حفت سے بچا لیتی ہیں۔"۲۹

اشفاق احمد کی اس پسند کی شادی میں ان کے ایک بھائی نے ساتھ دیا تھا۔ اس بھائی کا خاکہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"اشفاق کا ایک بھائی جسے ہم کھکھو کہتے تھے منفرد کردار کا مالک تھا۔ طاقت
ور، دلیر، ان جھک، منہ پر بات کہہ دینے والا، کڑوی سے کڑوی بات کہہ
دینے والا۔ ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی، دنیاداری سے بے پرواہ، بات کا پکا،
سچ کا ساتھ دینے والا۔ کھکھو ایک منفرد اور عظیم کردار کا مالک تھا۔"۳۰

الکھ نگری کا چھٹا باب "خواجہ جان محمد" کے نام سے ہے۔ اس باب میں ممتاز مفتی یادوں کی دنیا میں گم ہو کر اپنی جوانی کی کئی شخصیات کو یاد کرتے ہیں اور قارئین سے ان کا تعارف بھی کرواتے ہیں۔ ان شخصیات میں ایک اہم شخصیت دہلی کے حاجی صاحب ہیں۔ جن کے ہاتھ پر ان کی والدہ نے بیعت کیا تھا۔ والدہ کی خواہش پر ممتاز مفتی، حاجی صاحب سے ملنے گئے تھے۔ حاجی صاحب کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"میرے سامنے ایک نحیف ونزار آدمی کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں مشکل سے
جسم کو اُٹھائے ہوئے تھیں اور سر چل رہا تھا۔ انداز میں بے بسی بھری ہوئی
تھی۔ وہ ہمیں بڑے تپاک، اخلاق اور عجز سے ملے۔---حاجی صاحب میں
بزرگوں والی کوئی بات نہ تھی۔ ان کا عجز، اخلاق، رواداری اور وسعت
خیال۔ وہ ایک اعلیٰ انسان تھے، بزرگ نہیں۔"۳۱

ممتاز مفتی طویل یادوں کی دنیا سے نکلنے کے بعد بھائی جان (جان محمد بٹ) سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔

"میرے سامنے ایک پُر وقار انسان کھڑا تھا، اونچا لمبا، خوبصورت متوازن، خود
اعتمادی سے بھرپور، جس میں سے اخلاق کے چھینٹے
اڑ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے روبرو ایک بزنس ایگزیکٹو کھڑا
ہے، جو چاک وچوبند ہے، اصولوں کا پابند ہے۔ وقت

کی اہمیت کا احساس رکھتا ہے، زائد بات منہ سے نکالنے سے گریز کرتا ہے اور
باوقار انداز سے خوش اخلاقی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔"۳۲

بھائی جان کے بارے میں ممتاز مفتی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"جان محمد بٹ خوبصورت نوجوان تھے۔ خوش پوش تھے۔ پُروقار تھے۔ جوانی
میں خواتین کی توجہ ان پر مرکوز رہا کرتی تھی۔"۳۳

اسی ملاقات میں راجہ شفیع کا ذکر بھی ہوتا ہے۔

"راجہ شفیع بنیادی طور پر یوسف ظفر کا دوست تھا۔ وہ پوٹھوہار کا رہنے والا
ایک بانکا نوجوان تھا۔ طبعاً وہ لاہور کا بھاما جھا تھا، جذباتی، محنتی، خدمتی، دلیر
، ان جھک، خوش لباس، باوقار اوپر سے جدیدیت کا متوالا، اندر سے روایت کا
پابند، دوستوں کا دوست، اونچے اور قابل لوگوں سے دوستی رکھنا باعث فخر
سمجھتا تھا۔---راجہ شفیع طبیعت کے لحاظ سے ایک بانکا آدمی تھا، اچھا کھاتا تھا
، اچھا پہنتا تھا، اچھا جیتا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے راجہ شفیع لاہور کا بھاما جھا تھا
۔ جذبات سے چھلکتا ہوا، خدمت کار سیا، عقیدت میں سرشار تھا۔---وہ حتی
الوسع ہر حاجت مند کا کام کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک مجلسی آدمی
تھا، لوگوں سے رابطہ رکھتا تھا۔---راجہ شفیع ذہنی آدمی نہیں تھا، دانش ور
نہیں تھا۔ وہ دل کے زور پر جیتا تھا، اس لیے سکھی رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں
ایک روانی تھی۔ اس میں سے جذبات کی ایک پھوار اڑتی رہتی تھی۔ جو
گردوپیش کو بھگو دیتی تھی۔---راجہ شفیع خیالات اور عادات اور جذبات
میں بری طرح گندھا ہوا تھا۔"۳۴

خواجہ جان محمد کے باب میں ایک عنوان "یہ اللہ، وہ اللہ" ہے۔ اس موقع پر ممتاز مفتی اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بچپن میں ان کے بڑوں نے ان کے ذہن میں اللہ کا نقشہ کیسا بنا رکھا تھا اور انہیں یہ ساری صفات اپنے مولوی صاحب میں دکھائی دیتی تھیں۔

"مولوی صاحب میں اللہ میاں کی صفات موجود تھیں ایک تو وہ بہت بڑے
تھے، قابل تعظیم تھے، سب کچھ جانتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں

دیکھ کر ڈر کے مارے ہمارا دم نکلتا تھا۔ مولوی صاحب کے چہرے پر ہر وقت ایسا تناؤ رہتا تھا جیسے ماجھا لگی ڈور ہو جو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ خدوخال میں ہر وقت ایک دھونس نیم مستور، نیم عریاں دبکی رہتی تھی۔ ناراض نہ بھی ہوتے تو بھی معلوم پڑتا کہ اب ہوئے، کہ اب ہوئے۔ آواز میں کاٹ تھی۔ منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ میں دھار تھی۔ کھنکھارتے تو ایسے لگتا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔"۳۵

بچپن میں یہ تصویر ممتاز مفتی کے ذہن میں اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ اللہ کی دہشت اور خوف سے بچنے کے لیے انھوں نے اللہ کے خیال کو دل میں لانا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن پھر ان پر ایک وقت ایسا آیا جب انہیں احساس ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کی موجودگی میں ڈر یا خوف کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

الکھ نگری کا ساتواں باب "قدرت اللہ شہاب" کے نام سے ہے۔ اس کا پہلا عنوان کراچی ہے اس عنوان کے تحت بھی ممتاز مفتی نے کچھ شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ کراچی تبادلے کے بعد ممتاز مفتی کی سب سے پہلی ملاقات احمد بشیر سے ہوتی ہے۔ احمد بشیر کے ذکر کے ساتھ انھوں نے زیڈ-اے-بخاری کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے۔

"بخاری پڑھا لکھا تھا، کلچرڈ تھا، فن کار تھا، اعلیٰ پائے کا دانشور تھا، بات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ بات پکڑنے کا گُر جانتا تھا، باتوں میں کوئی اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار آواز کی کھرج تھی۔"۳۶

احمد بشیر کا ذکر جاری ہے کہ اس میں اس کی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے بارے میں بتاتے ہیں:

"مودی احمد بشیر کی بیوی ہے۔ کیا عجیب شے تھی وہ۔ کمرے سے چلی جاتی تو پتہ نہ چلتا کہ چلی گئی ہے۔ کمرے میں آ جاتی تو پتہ نہ چلتا کہ آ گئی ہے۔ مودی بڑی شوقین مزاج ہے اسے میل ملاپ سے دلچسپی ہے۔ خوب صورت لباس پہننے کا شوق ہے۔ کبھی اتنے پیسے ہاتھ نہیں لگے کہ لباس خرید سکے، اس لے لنڈے سے میٹریل خریدتی ہے اور ایسا بنا سجا کر پہنتی ہے جیسے کسی اونچے سٹور سے خریدا ہو۔ مودی، احمد بشیر کی عادت ہے۔ اسے کھلاتی ہے، پلاتی

ہے، سلاتی ہے، جگاتی ہے اور منہ بنائے بغیر اس کے دانشورانہ لیکچر سنتی رہتی ہے۔"۳۷

الکھ نگری میں ممتاز مفتی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ان کا سب سے بڑا مشاہدہ قدرت اللہ شہاب ہے۔ ساتویں باب سے قدرت اللہ شہاب کی کہانی شروع ہو جاتی ہے اور ممتاز مفتی ان کی زندگی کے واقعات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس بیان کے دوران قدرت اللہ شہاب کا شخصی خاکہ کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

"چھوٹے قد کا ہے۔ جسم گٹھا ہوا۔ شخصیت میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ بہت عمدہ انگریزی لکھتا ہے۔ کم لفظوں میں بڑی بات کہہ دیتا ہے۔-- -اس کی قابلیت کی بڑی دھوم ہے۔ بڑا ذہین آدمی ہے۔ آپ بات شروع کریں تو فوراً ساری بات سمجھ جاتا ہے۔ سنتا ہے، بڑی توجہ سے سنتا ہے۔ بولتا نہیں۔ گونگا ہے، چہرے سے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہوتا۔---کہ خوش ہے یا ناراض۔ بلینک چہرہ ہے۔ جیسے پتھر کا بنا ہو۔ اس کی خاموشی دوسرے کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن اس میں ذرہ بھر تفاخر نہیں ہے، دکھاوا نہیں "میں" نہیں۔ عجز اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔"۳۸

"شخصیت کے لحاظ سے پہلی نظر میں قدرت خاصے پھٹیچر نظر آتے تھے۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، بات کرنے سے عاری، گونگے، محفل میں بیٹھتے تو اس قدر سنجیدہ اور خاموش جیسے پتھر کے بنے ہوئے ہوں، اونچائیوں سے خائف رہتے،---بیوروکریٹس میں بیٹھتے تو جیسے راج ہنسوں میں کوا بیٹھا ہو۔ شور و شغب سے سخت گھبراتے تھے۔ تقریر کرنی پڑ جاتی تو دل بیٹھ بیٹھ جاتا۔ ازلی کے لیے تنہا۔ اپنی ان کمیوں کو چھپانے کے لیے انہوں نے خود پر سنجیدگی بھری چپ طاری رکھی تھی۔ یہ سنجیدگی بھری خاموشی قدرت اللہ کا واحد ہتھیار تھا۔---ان کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ ان میں آہنی ضبط تھا۔ اندر بڑے طاقتور شاک ابزار بر لگے ہوئے تھے۔ ان میں شدید ترین تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت موجود تھی اور بڑے سے

بڑے کرب کے دوران کیا مجال کہ چہرے پر اظہار کی جھلک نظر آئے۔ ان کا چہرہ گونگا تھا، ایسا کہ طوفان مچا ہوتا لیکن باہر سکون ہی سکون ہوتا۔ قدرت اللہ اس قدر ذہین تھے کہ بات کرنے والا ابھی تمہید باندھ رہا ہوتا کہ وہ ساری بات سمجھ جاتے۔"۳۹

"قدرت میں قابلیت اور ذہانت تو تھیں لیکن نہ قابلیت چمک رہی تھی، نہ ذہانت۔ دیکھنے میں یوں لگتا جیسے گونگا پہلوان ہو، پڑھنے سے واسطہ نہ ہو۔ البتہ ذہنی طور پر بڑا "الرٹ" تھا۔ دُکان میں مال تو تھا لیکن شوونڈو کا وجود نہ تھا۔ ادیب تو تھا، جانا پہچانا ادیب تھا لیکن شخصیت میں ادیبانہ رنگ نہ تھا ۔ دانشور تو تھا لیکن بات کرنے کی نسبت بات سننے کا شوقین تھا۔ سٹیٹس کا نشس نہ تھا، طبیعت میں عجز کا رنگ غالب تھا۔ غربت پر نہ تو ناک چڑھاتا نہ معذرت خواہ ہوتا۔ دوسروں کو اتنی عزت سے بلاتا تھا کہ تو تڑاخ کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ لہٰذا مجھے بے تکلفی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔"۴۰

"قدرت کی شخصیت میں دو بڑی زبردست قوتیں تھیں۔ اس میں سہہ جانے ،برداشت کر لینے کی قوت عام انسانوں سے بہت زیادہ تھی۔ دوسرے اس کی ول پاور اس قدر طاقتور تھی کہ دوسرے کو زچ کر سکتا تھا۔ قدرت میں طمع نہیں تھی، حرص نہیں تھی، نمائش نہیں تھی لیکن ساتھ ہی اس میں چند ایک کمزوریاں بھی تھیں یہ کمزوریاں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔ مثلاً اس میں ایک جھجک تھی۔ ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ تھی۔ لیکن وہ اپنے آہنی عزم کی مدد سے اس جھجک اور ہچکچاہٹ کو دور نہ کر سکا تھا۔ جب بھی وہ حملہ کرتی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتا۔ اسے ایک دھکا لگتا لیکن جلد ہی سنبھل جاتا۔"۴۱

قدرت اللہ شہاب کی بیگم کے بارے میں ممتاز مفتی نے لکھا ہے:

شہاب کی بیگم، ڈاکٹر عفت دیکھنے میں نہ بیگم نظر آتی تھیں، نہ ڈاکٹر۔ وہ ایک ورکنگ وُمن تھی، سادہ مگر پُر وقار۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت خوش مزاجی تھی۔ وٹ اور ہیومر دونوں ان کی گفتگو میں کوٹ کوٹ کر بھرے

ہوئے تھے۔ان کی وٹ میں طنز تو ہوتی تھی مگر اس کی دھار نہ ہوتی۔اس لیے
کاٹ نہ ہوتی۔جب وہ خاموش ہوتیں تو بھی ہونٹ ہوں چٹکی بھرے ہوتے
جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سن کر بیٹھی ہوں یا کوئیپر مزاح بات کہنے والی
ہوں۔"۴۲

ممتاز مفتی کے حلقہ احباب میں ایک نام آغا حنیف صاحب کا بھی آتا ہے۔ان کی شخصیت کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"آغا حنیف دور جدید کا نمائندہ تھا۔خوش لباس تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے ڈرائی کلینر
کی دکان سے نکل کر آیا ہو۔باقاعدگی سے قیمتی سوٹ پہنتا۔پتلون کی کریز کی
دھاریاں نمایاں رہتی جیسے تلوار ہو،بھڑکیلی توجہ طلب نکٹائی۔ ---آغا
حنیف بظاہر ایک متحمل فرد تھا۔اخلاق کا پابند تھا۔اس کا برتاؤ لوگوں سے
بہت اچھا تھا۔بڑا ہمدرد تھا۔خدمت گزار تھا،لیکن اس کے اندر بلا کا غصہ دبا
ہوا تھا،غصّے کا اظہار کبھی کبھار ہوتا تھا،لیکن جب ہوتا تو گویا آتش فشاں
پھٹ جاتا تھا۔اس میں مجذوبیت کا عنصر موجود تھا۔"۴۳

بات سے بات نکالتے ہوئے ممتاز مفتی نے اپنے ایک داماد مقبول قریشی کا بھی ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"مقبول قریشی ایک خوش مزاج،خوش پوش نوجوان تھا۔اس میں مزاح کی
حس موجود تھی،لیکن بنیادی طور پر وہ ایک سنجیدہ اور عقلیہ نوجوان تھا۔سو
واٹ رویے کو ناپسند کرتا تھا۔اکاؤنٹس میں ہونے کی وجہ سے جذباتی رویے کا
قائل نہ تھا۔وہ پیری مریدی کو ناپسند کرتا تھا۔"۴۴

قدرت اللہ شہاب کے بہنوئی محمد امین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قدرت کا بہنوئی کشمیری تھا۔وہ ایک صراط مستقیمی فرد تھا۔نیک دل تھا
،سخی تھا،محنتی تھا،جذباتی تھا،شدت کا مارا ہوا تھا اور بے حد عصیل تھا۔وہ خود
جھوٹ بولنے سے گریز کرتا تھا۔جھوٹ بولنے والے کو سخت ناپسند کرتا
تھا۔منہ پھٹ تھا،اصولوں کا پابند تھا،پکا مسلمان تھا،صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔
دفتر میں وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کر دیتا تھا اور کسی قسم کے فیور ٹزم کو گوارا نہ

کرتا تھا۔ حکومت کے احکامات بھی اگر اصول و قانون سے ہٹ کر ہوتے تو وہ ان کی تعمیل سے برملا انکار کر دیتا تھا۔ وہ پیر پرستی کے سخت خلاف تھا۔ عمل اور صرف عمل کا قائل تھا۔"۴۵

آگئے چل کر قدرت اللہ شہاب کے بھائی کا بھی خاکہ بیان کیا ہے۔

"حبیب ایک عقلیہ آدمی تھا۔ اس کی زندگی میں عقل اور دلیل کی بڑی اہمیت تھی۔ ایکسٹر ووورٹ تھا، سوشل تھا، شدت سے حقیقت پسند تھا۔ جذباتی لوگوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت میں مذہبی رجحان نہ تھا۔ پیروں فقیروں کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ لاگ لگاؤ کا قائل نہ تھا۔ اس کے باوجود قدرت اللہ سے اسے بڑی محبت تھی اور جب بھی قدرت پر کوئی مصیبت آنے والی ہوتی وہ بے چین ہو جاتا، بے وجہ بے چین ہو جاتا۔ ایک بے نام بے چینی اسے اپنی گرفت میں لے لیتی۔---حبیب شہاب طبعاً قدرت اللہ سے مختلف تھا۔ وہ ایک جرنلسٹ تھا، سوشل تھا، بات چیت کرنے کا دلدادہ، میل جول کا شوقین۔ قدرت کی طرح وہ انٹرووورٹ نہیں تھا بلکہ ایکسٹر ووورٹ تھا۔ قدرت کی پُر اسرار زندگی کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے اسے رازدان کا رول ادا کرنا پڑا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بیانات میں بہت محتاط ہے۔"۴۶

سید فیضی، ممتاز مفتی کا دوست تھا اور ان کا ہم کار بھی رہ چکا تھا۔ ایک دفعہ ممتاز مفتی صاحب کو ان کی مدد کی ضرورت پڑی۔ اس ضرورت کا ذکر بیان کرتے ہوئے مفتی نے ان کا شخصی خاکہ بھی بیان کیا ہے۔

"فیضی کی شخصیت میں بڑے تضادات تھے۔ وہ بیک وقت عالم بھی تھا، ادیب بھی، مولوی بھی اور رند بھی تھا۔ اس میں رنگین مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر بات پر ہنستا۔ ہر اڑتے ہوئے رنگین پلو کی طرف متوجہ ہو جاتا ۔ ہر نسائی آواز پر کان کھڑے ہو جاتے، آنکھیں اثر سے بھیگ جاتیں۔ پتلیاں لیٹیں مارتیں۔"۴۷

ممتاز مفتی کو ایک محبت بڑھاپے میں ہوئی تھی۔ ان خاتون کا نام عالم بی بی تھا۔ عالم بی بی کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا خاکہ اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

"وہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ چہرا چوکور تھا۔ آنکھیں لگاؤ کی بھیگ سے بھری ہوئی تھیں۔ رنگ نہ گورا تھا نہ سانولا۔ لگتا تھا جیسے ہلدی ملی ہوئی ہو۔ خدوخال میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔ طبیعت میں شدت نہ تھی، تلخی نہ تھی، شوخی نہ تھی، آواز مدھم مدھم، انداز ٹھہرا ٹھہرا۔"۴۸

تیرہواں باب "رسمی معلومات" کے عنوان سے ہے۔ اس کا پہلا ذیلی موضوع "داستان سرائے" ہے۔ داستان سرائے کا نام سنتے ہی اشفاق احمد کا نام ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے ذکر میں ممتاز مفتی نے ان کا ایک نیا روپ دکھایا ہے لکھتے ہیں:

"اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک شریف النفس انسان ہے۔ اس کے اندر خیر کا عنصر حاوی ہے۔ اسے غصہ ضرور آتا ہے لیکن وہ اسے نکالنا نہیں جانتا۔ لہٰذا اندر چڑچڑ ہوتی رہتی ہے۔ بھٹیاری دانے بھونتی رہتی ہے۔ اس کا غصہ خود کو ضرب لگاتا رہتا ہے۔ لہولہان کر دیتا ہے۔ اشفاق احمد کسی کے خلاف سازش نہیں کر سکتا۔ اپنی پارٹی نہیں بنا سکتا۔ جال نہیں پھیلا سکتا۔"۴۹

اس عنوان کے تحت ممتاز مفتی نے اشفاق احمد کے والد کی شخصیت بھی بیان کی ہے:

"اشفاق احمد کے والد بڑے خان خوب آدمی تھے۔ ان کی قابلیت ہفت رخی تھی۔ ساتھ ہی وہ بڑے جابر ہیڈ آف دی فیملی تھے، جب وہ گھر میں پاؤں رکھتے تو سناٹا چھا جاتا۔ ان کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا تھا۔"۵۰

اشفاق احمد کو ایک بزرگ نور بابا سے بڑی عقیدت تھی۔ ممتاز مفتی نے نور بابا کے ذکر میں ان کا خاکہ ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"نور بابا دیکھنے میں تو ایک عوامی فرد تھا۔ وہ پیروں اور مرشدوں کی طرح مسند پر نہیں بیٹھتا تھا۔ مسئلے نہیں چھانٹتا تھا۔ سرکار قبلہ بن کر ارشادات فرمانے کا عادی نہ تھا۔ وہ ایک لمبا سا چغہ پہنے رکھتا اور ننگے پاؤں یوں گھومتا پھرتا جیسے کوئی خدمت گار ہو لیکن جب بات کرتا تو بڑی بڑی صفیانہ سچائیاں

چھوٹے چھوٹے جملوں میں بر سبیل تذکرہ کہہ جاتا۔اس کے پاس ایسے
بیسیوں جملے تھے، جنہیں سن کر دانشور چونک جاتے اور سوچنے پر مجبور
ہو جاتے۔"۵۱

داستان سرائے کے تحت ممتاز مفتی نے اپنے گھر کا بھی ذکر چھیڑا ہے جس میں انھوں نے عکسی مفتی کی شادی کا ذکر کیا ہے کہ یہ شادی کس طرح طے پائی۔ عکسی مفتی نے اپنے لیے جی ایم اثر کی بیٹی کا انتخاب گیا تھا۔ ممتاز مفتی نے جی ایم اثر کی شخصیت کو مختصراً بیان کیا ہے۔

"جی ایم اثر کی شخصیت میں تین خصوصیات نمایاں تھیں۔وہ ایک پڑھا
لکھا قابل آدمی تھا۔اس قدر کلچرڈ تھا کہ بڑی شدت سے رکھ رکھاؤ کا
متوالہ تھا اور تیسرے محبوبہ صراحی اور بوتل کا دلدادہ تھا۔"۵۲

اسی طرح جی ایم اثر کی بیٹی تہمینہ (جو بعد میں ان کی بہو بنی) کی شخصیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"تہمینہ بہت ہی ذہین لڑکی تھی۔بڑی ایکسٹر وورٹ۔جرأت سے بھرپور
۔منہ پھٹ، قابلیت میں اپنے باپ جیسی۔باپ کی
پرستار لیکن اونچی ناک والی۔محبت کرنے والی، ساتھ ہی غصیل۔بھانبھڑ
لگانے والا غصہ، وہ تو اغوا کرنے والی تھی۔ہونے والی نہیں۔"۵۳

الکھ نگری اپنے اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے آخری باب تک پہنچ گئی ہے۔ آخری باب کا عنوان "آخری ایام" ہے۔اس باب میں ممتاز مفتی نے "چھوٹا اور بڑی" کے نام سے اپنی شخصیت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہاں پوری تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ ابتداء سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"ممتاز مفتی زندگی میں ربط سے محروم فرد ہے۔ میل اڈجسٹڈ پیدائشی طور پر
چھوٹا آدمی ہے۔بڑے آدمی سے مل کر جھجک محسوس کرتا ہے، گھبراتا ہے،
کتراتا ہے، اسے کسی بنے سجے گھر میں لے جایئے۔ چلا جائے گا، لیکن دل دھک
دھک کرے گا، سانس رکے گا، اندر ڈگمگ ڈگمگ ڈولے گا، یہ میں کہاں آ گیا
ہوں۔اسے کسی اونچے عہدے پر بٹھادو۔بیٹھ تو جائے گا لیکن یوں جیسے کانٹوں
پر بٹھادیا گیا ہو۔افسروں کے ساتھ نہیں گھلے ملے گا۔ چھوٹے سٹاف کے

درمیان ایٹ ہوم محسوس کرے گا۔ دفتر کے چپڑاسیوں کو سلام کرنا اس کی
پرانی عادت ہے۔ افسر کے ساتھ اس کا برتاؤ یا تو جی حضور یہ ہوتا ہے اور یا کھچا
کھچا۔ میانہ روی سے محروم ہے۔ جی حضور یا ہو تو سر اسر جی صاحب! جناب
عالی!! لیں سر!!!"۵۴

الکھ نگری میں مذکورہ بالا شخصی خاکوں کے علاوہ بھی بہت سی دوسری شخصیات کے مختصر شخصی خاکے موجود ہیں۔ جن کا ذکر کرنا راقم الحروف نے ضروری نہیں جانا۔ مجموعی طور پر "الکھ نگری" ایک منفرد مقام کی حامل کتاب ہے۔ اسے ممتاز مفتی کی خود نوشت سوانح کے دوسرے حصے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ لیکن الکھ نگری کے مطالعے سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت کم اور شخصی خاکوں کا مجموعہ زیادہ ہے۔ اس میں شامل کئی شخصی خاکے، ممتاز مفتی اپنی شخصی خاکوں کی کتابوں میں تحریر کر چکے ہیں۔ اِن خاکوں کی اہمیت اُن کتابوں میں جتنی زیادہ جاندار ہے یہاں اِن کا بیان قاری کے لئے اتنا ہی بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ الکھ نگری میں جگہ جگہ واقعات کا تکرار پایا جاتا ہے، کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو ممتاز مفتی اپنی دوسری تحریروں میں بیان کر چکے تھے لیکن ان کا یہاں دوبارہ ذکر عدم دلچسپی کی وجہ بنتا ہے۔ ایک بات اور جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ کہ الکھ نگری جو ممتاز مفتی کی آپ بیتی ہے اس میں ممتاز مفتی پیش منظر میں رہنے کے بجائے پس منظر میں زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے الکھ نگری کی اہمیت آپ بیتی کی سی محسوس نہیں ہوتی۔

حوالہ جات:

۱۔ منصف خان سحاب، نگارستان، مکتبہ جمال لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۰ء، ص ۳۶۴

۲۔ محمد حسین جامی، اردو خاکہ نگاری، دارالشکور لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۴ء، ص ۵۱

۳،۴۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز لاہور، سن اشاعت ۱۹۹۷ء، ص ۳۶۶

۵۔ ممتاز مفتی، اور اوکھے لوگ، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۲

۶۔ ممتاز مفتی، پیاز کے چھلکے، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت جون ۲۰۱۲ء، ص پیش لفظ

۷۔ ممتاز مفتی، اوکھے اولڑے، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت مئی ۲۰۱۵ء ص ۱۱

۸۔ ممتاز مفتی، الکھ نگری، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت، اگست ۲۰۱۶ء، ص (کتاب کی بات)

۹،۱۰۔ ایضاً ص ۱۷۷

۱۱۔ ایضاً ص ۲۰

۱۲۔ ایضاً ص ۶۹

۱۳۔ ایضاً ص ۷۲

۱۴۔ ایضاً ۱۳۳

۱۵۔ ایضاً ص ۱۸۴

۱۶۔ ایضاً ص ۱۹۶

۱۷۔ ایضاً ص ۱۸۵

۱۸۔ ایضاً ص ۲۱۱

۱۹۔ ایضاً ص ۲۳۰

۲۰۔ ایضاً ص ۲۴۳

۲۱۔ ایضاً ص ۲۶۰

۲۲ تا ۲۸۔ ایضاً ص ۲۶۲، ۲۶۳

۲۹۔ ایضاً ص ۲۶۵

۳۰۔ ایضاً ص ۲۸۱

۳۱۔ ایضاً ص ۲۹۰

۳۲۔ ایضاً ص ۳۰۸

۳۳۔ ایضاً ص ۵۴۰

۳۴۔ ایضاً ص ۳۲۵

۳۵۔ ایضاً ص ۳۱۲

۳۶۔ ایضاً ص ۳۳۵

۳۷۔ ایضاً ص ۳۳۹

۳۸۔ ایضاً ص ۳۷۰

۳۹۔ ایضاً ص ۴۲۳

۴۰۔ ایضاً ص ۴۳۰

۴۱۔ ایضاً ص ۴۶۵

۴۲۔ ایضاً ص ۳۷۶

۴۳۔ ایضاً ص ۵۴۱

۴۴۔ ایضاً ص ۵۸۹

۴۵۔ ایضاً ص ۶۰۱

۴۶۔ ایضاً ص ۶۳۷

۴۷۔ ایضاً ص ۶۰۶

۴۸۔ ایضاً ص ۶۵۶

۴۹۔ ایضاً ص ۶۷۹

۵۰۔ ایضاً ص ۶۷۸

۵۱۔ ایضاً ص ۶۸۲

۵۲۔ ایضاً ص ۶۸۵

۵۳۔ ایضاً ص ۶۸۶

۵۴۔ ایضاً ص ۷۴۷